یوسف خان جذاب☆

سرسید احمد خان اور تاریخی افسانے

ماہنامہ الشریعہ کے ستمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں ''تاریخی افسانے اور اُن کی حقیقت'' کے عنوان سے میرا ایک تاثراتی مضمون شائع ہوا تھا جو دراصل پروفیسر شاہدہ قاضی صاحبہ کے مضمون (الشریعہ، مئی ۲۰۰۵) سے شروع والے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں ضیاء الدین لاہوری صاحب نے میرے مضمون کے جواب میں ایک تحریر لکھی ہے، تاہم ان کا جواب میرے مضمون کے فقط ایک حصے سے متعلق تھا، اسی لیے انھوں نے اسے ''سرسید کے بارے میں تاریخی افسانوں کی حقیقت'' کا عنوان دیا۔ اگرچہ لاہوری صاحب کو سید صاحب کے بارے میں میری رائے سے اختلاف ہے، تاہم مضمون کے بنیادی مدعا سے انھوں نے اتفاق ظاہر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں۔ ''سرسید کے بارے میں ایسی باتوں کو بھی حقیقت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو خود تاریخی افسانوں کے ضمن میں آتی ہیں۔'' (الشریعہ، اکتوبر ۲۰۰۵، صفحہ ۲۱)

بلاشبہ سید صاحب کی شخصیت کے گرد عقیدت کا ایک خول چڑھا دیا گیا ہے، لیکن ایسا خول کس ''مسلم شخصیت'' کے گرد موجود نہیں؟ یہ تو مسلمانوں کی موروثی بیماری ہے کہ عقیدت کے زیر اثر وہ اپنی پسندیدہ شخصیات کی اجتہادی لغزشوں کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ اس امت کا المیہ ہے۔ ان شخصیتوں نے خود کبھی اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر قرار نہیں دیا۔ یہ ہم ہیں جو انھیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیتے اُور اُن کی ہر بات کو وحی کا درجہ دے دیتے ہیں۔ عظیم شاعر رحمان باباؒ نے اس رویے کی عکاسی یوں کی ہے: ''میں نے اُن درویشوں کی پرواز کا مشاہدہ کیا ہے جو ایک قدم اُٹھا کر عرش کو چھو لیتے ہیں۔''

میں نے اپنے مضمون میں صوفیائے کرام کے حوالے سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا، تاہم صوفیائے کرام پر بس نہیں، ہمارے علمائے کرام کا حال بھی یہی ہے کہ اندھی تقلید اور عقیدت کے گہرے جذبات کے تحت ائمہ کرام کی ہر بات کو حرف آخر تصور کرتے ہیں اور مولانا مفتی محمد شفیع کے الفاظ میں حدیث کو بھی 'حنفی' بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف سید صاحب ہی کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا گیا، یہ ملمع کاری ہر بڑی مسلم شخصیت پر ہوئی ہے۔ سید صاحب تو ماضی قریب کی شخصیت ہیں اور اُن کی شخصیت پر چڑھایا جانے والا گرد و غبار نسبتاً کم ہے۔ ورنہ جوں جوں

☆ گاؤں نار شکر اللہ۔ سرائے نورنگ۔ ضلع بنوں

ہم ماضی میں سفر کرتے جاتے ہیں، مسلم شخصیتوں کے گرد عقیدت وتقدس کے افسانوی ہالے نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں دوسری مسلم شخصیتوں کی ملمع کاری کو سید صاحب کے حوالے سے وجہ جواز نہیں بنا رہا، میرا مدعا صرف یہ ہے کہ سید صاحب کا معاملہ کوئی استثنائی معاملہ نہیں۔

سید صاحب ایک ذہین انسان تھے اور انسانی دماغ سے لغزشیں اور خطائیں سرزد ہوتی ہیں، اس لیے انہوں نے جو کچھ کہا اور لکھا، اسے حرف آخر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اُن کی باتیں درست بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی۔ تاہم ایک نقاد کا فرض بنتا ہے کہ جب وہ کسی شخصیت پر قلم اُٹھائے تو پہلے اس کے موقف اور فکر کی اس کے زاویہ نگاہ سے دیانت دارانہ طریقے سے وضاحت کرے اور پھر دلائل کی روشنی میں اُس کی درستی یا نادرستی کو واضح کرے۔ کسی کے موقف کی استدلالی غلطی کو واضح کرنے کے بجائے اس کی نیت اور ذات پر حملہ آور ہونا ایک غیر علمی اور غیر سنجیدہ رویہ ہے اور نقاد کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ کوئی شخص کوئی کام کس محرک کے تحت کرتا ہے، اس کا تعلق نیت جاننے سے ہے اور نیتوں سے خدا ہی واقف ہے۔ خدا سے ڈرنے والے عالم کبھی اس دائرے میں قدم رکھنے کی جسارت نہیں کرتے۔ اسی لیے حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے سر سید کے خلاف کفر کے فتوے پر دستخط نہیں کیے۔ محترم لاہوری صاحب نے اپنی تنقید میں اس اصول کا خیال نہیں رکھا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اور خصوصاً سر سید کے متعلق اپنی کتابوں میں اُن کی شخصیت کے متعلق بعض قطعی فیصلے صادر کیے ہیں، حالانکہ انھیں کو چاہیے تھا کہ وہ سید صاحب کے مذکورہ موقف کے پس منظر میں کارفرما ان کے بنیادی فکری استدلال کو واضح کر کے اس پر تنقید کرتے اور پھر قاری کو موقع دیتے کہ وہ ان سے اتفاق یا اختلاف کرے۔

میں نے لکھا تھا کہ سید صاحب پر انگریزوں کی وفاداری اور مجاہدین آزادی کی مخبری کا الزام لگانا سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ اس کے جواب میں لاہوری صاحب نے مکتوبات سر سید سے یہ فقرے نقل کیے ہیں کہ

> ''بڑا شکر خدا کا ہے کہ اس ناگہانی آفت میں جو ہندوستان میں ہوئی، فدوی بہت نیک نام اور سرکار دولت مدار انگریزی کا طرف دار اور خیر خواہ رہا'' (الشریعہ، اکتوبر ۲۰۰۵، صفحہ ۲۱)

پھر بتاتے ہیں کہ انہیں اس خیر خواہی کا صلہ انعام واکرام کی صورت میں ملا۔ لاہوری صاحب مزید لکھتے ہیں کہ علی گڑھ تحریک کا واحد مقصد انگریزوں کی وفاداری تھا۔ اس کے حق میں انھوں نے سید صاحب کا درج ذیل اقتباس نقل کیا ہے:

> ''ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی، جس کے سایہ عاطفت میں ہم امن وامان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔ میری یہ رائے آج کی نہیں بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اس رائے پر قائم اور مستقل ہوں۔'' (ص ۲۲)

میں نے اپنے مضمون میں اگر سر سید صاحب پر انگریزوں کی وفاداری کے الزامات کو ''ظلم اور ناانصافی'' قرار دیا تو اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ ان الزامات کے حوالے سے سر سید کا موقف صحیح تناظر میں پیش نہیں کیا گیا۔ تنقید میں پس منظر کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر تنقید میں فقط ''مجرد حقائق'' پیش کیے گئے ہوں اور ان ''حقائق'' کا رشتہ تاریخی وواقعاتی سیاق وسباق سے کاٹ دیا گیا ہو تو ایسی تنقید علمی لحاظ سے کوئی وزن نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر لکھنے والے کا اپنا ایک

زاویہ نگاہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ لکھتا ہے۔ سید صاحب بھی باقاعدہ ایک فکری نظام کے تحت لکھ رہے تھے۔ انگریزوں کے حوالے سرسید صاحب کا موقف ان کے رائے میں ایک مذہبی اساس رکھتا تھا، جیسا کہ ''ہمارا مذہبی فرض ہے'' اور ''خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے'' کی قسم کے جملوں سے واضح ہے۔ اپنی ''تفسیر القرآن'' میں وہ لکھتے ہیں:

''اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے اُن کو امن دیا ہو، مسلمان ہو یا کافر، اس کی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔ کافروں کے ساتھ بھی جو عہد و اقرار ہوئے ہوں، ان کو نہایت ایمان داری سے پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اس میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے، حملہ کر کے مغلوب و مجبور کرنے کو پسند نہیں کرتا، یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اسے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ ایک اس حالت میں جبکہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے، نہ کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔ کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں، خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے۔ مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جبکہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ان کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ مگر اس حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمانداری کا بتایا ہے کہ جو لوگ اس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں، یا امن کا علانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور گو صرف بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور اس میں امن لیے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں، بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں، ان کا ان مظلوم مسلمانوں کے بچانے کی جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے یا ان کے لیے امن اور ان کے لیے ادائے فرض مذہبی کی آزادی حاصل کرنے کو، تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیاوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو، اس کو مذہب کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔'' (بحوالہ نقش سرسید، ضیاء الدین لاہوری، صفحہ ۶۹)

سید صاحب ایک دور اندیش آدمی تھے۔ انہیں انگریزی استعمار کی طاقت کا علم تھا۔ اس لیے وہ معروضی حالات میں ان کی اطاعت کا مشورہ دیتے تھے۔ زمانہ دراز تک انگریزی حکومت کے دوام کی خواہش سے بھی ان کا مقصد مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان بے اعتمادی کی خلیج کو پاٹنا اور فاتح و مفتوح کے درمیان اعتماد کی فضا کو بحال کرنا تھا۔ انہیں مسلمانوں کی پسماندگی کی درست وجہ معلوم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زیادہ زور مسلمانوں کی تعلیم پر دیا۔ علی گڑھ تحریک حقیقی معنوں میں ایک علمی تحریک تھی۔ سید صاحب عقل پرست تھے۔ اس عقل پرستی نے انہیں دور اندیش بنا دیا۔ اپنے مذہبی مطالعے نے انہیں اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ کام نتیجہ رخی (Result Oriented) ہونا چاہیے۔ بے نتیجہ ٹکراؤ کا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ اس جذبے کے تحت انہوں نے مسلمانوں کو اطاعت فرنگ کا مشورہ دیا اور ان کی توجہ کا رُخ تعلیم کی طرف موڑنے کی کوشش

کی۔

مولانا خلیل احمد سہارنپوری، جو دیوبندی مکتب فکر کے ایک جید عالم دین اور حدیث کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد کے شارح ہیں، اسی طرح کے ایک اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

''آپ نے انگریزوں کی نسبت اعتراض فرمایا ہے کہ ابتداے سلطنت سے انگریزوں کا مطمح نظر حرارت ایمانی کا قلوب سے سلب کرنا تھا جو انھوں نے متعدد اور مختلف طریقوں سے اپنے مقصود کے حاصل کرنے کی تدبیریں کیں اور اس میں کامیاب ہوگئے اور من جملہ ان تدبیروں کے علی گڑھ کالج کی بنا بھی ہے کہ جس کے بانی نے حب مال وجاہ کی آڑ میں ترقی دنیا کا سبز باغ دکھلا کر مسلمانوں کے دلوں سے وہ تنفر اور توحش عن النصاریٰ بالکل نکال دیا جو اسلام کے لیے روح رواں تھا۔ اس کے متعلق مجھ کو اسی قدر عرض کرنا ہے کہ آپ غور فرماویں کہ یہ قصور کس کا ہے۔ نصرانیوں کا قصور ہے یا آپ کا؟ اجی صاحب وہ تو تمھارے دین کے دشمن ہیں، وہ جو کچھ کریں تھوڑا ہے۔ اس میں تو آپ اپنی شکایت کیجیے کہ آپ نے کیوں ان کا اثر قبول کر لیا۔ اور اگر غور کر کے دیکھو تو فی الحقیقت جس زمانہ میں انگریز ہندوستان میں آتے ہیں، اس وقت اسلامی سلطنت ہندوستان میں برائے نام رہ چکی تھی اور پنجاب میں سکھوں کا نہایت تسلط ہو گیا تھا۔ اگر انگریز ان کا قلع قمع نہ کرتے تو آج تمام ہندوستان میں سکھوں کا ڈنکا بجتا۔ ان کا طرز حکومت جو کچھ تھا اور جو کچھ وہ اسلام اور اسلامیات کی مزاحمت کرتے تھے، وہ آپ سے مخفی نہیں۔ اگر خدا نخواستہ ہندوستان پر ان کی سلطنت ہو جاتی تو آج مسلمانوں سے بھنگیوں اور چماروں کی طرح بیگار لی جاتی۔

میرے خیال میں تو خدا کی رحمت مسلمانوں پر ہوئی کہ انگریز آئے اور انھوں نے سکھوں کا قلع قمع کیا اور ایک مہذب سلطنت قائم ہوگئی جس نے مذہب کی آزادی کو اپنا اولیں فرض قرار دیا۔ یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے دماغ سلطنت کے قابل نہ رہے تھے اور اگر عام مسلمانوں نے کچھ قلیل سی کوشش کی بھی، کیونکہ تقدیر موافق نہیں تھی، کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں آپ الزام انگریزوں کے سر لگاتے ہیں کہ انھوں نے تدبیریں کر کے ہندوستانیوں سے حرارت وغیرت ایمانی کو سلب کر دیا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ترکی ومصر میں جہاں مسلمانوں کی بڑی زور کی سلطنت تھی، وہاں کس نے غیرت ایمانی کو سلب کر دیا تھا؟ کیا ہم نے ہی تم کو یہ تعلیم کیا تھا کہ تم ہمارے برے اوصاف تو لے لیجیو اور خبردار ہمارے بھلے اوصاف کو مت چھونا۔

رہا بانی علی گڑھ کا قصہ، اس کا جواب بھی اس ہی تقریر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ بانی علی گڑھ کی نیت کا علم خدا ہی کو ہے کہ اس نے اس کالج کی بنا کس نیت پر ڈالی۔ اگر اس کی نیت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں سے حرارت وغیرت ایمانی سلب ہو جاوے تو اس کا محاسبہ خدا تعالیٰ شانہ کے یہاں ہے اور اگر اس کی یہ نیت نہیں تھی بلکہ اس کی نیت محض دنیاوی ترقی تھی جس طرح میں گزشتہ تقریر میں عرض کر آیا ہوں تو پھر فرمایئے کہ یہ ہمارا ظن کیا ظن فاسد نہیں ہوگا؟'' (ماہنامہ الصیانہ، لاہور دسمبر ۲۰۰۲ ص ۹۱، ۲۰)

دیوبندی مکتب فکر کے ایک دوسرے جید عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

''سید احمد بڑے حوصلے کا آدمی تھا، مگر انھوں نے خواہ مخواہ دین میں ٹانگ اڑا کر اپنے آپ کو بدنام کیا، ورنہ ان کو تو لوگ دنیا کا تو ضرور ہی پیشوا بنا لیتے۔ بڑے محبِّ قوم تھے۔ دین میں رخنہ اندازی کرنے کی وجہ سے لوگ ان سے

نفرت کرنے لگے تھے۔ اسی سے نقصان ہوا۔...... یہ جو مشہور ہے کہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا، یہ غلط ہے بلکہ بڑا دانش مند تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ انگریز برسر حکومت ہیں۔ ان سے بگاڑ کر کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان سے مل کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' (ملفوظات حکیم الامت، ج ۱۱، ص ۲۶۷۔۲۶۹)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سرسید مجاہدین آزادی کی مخبری کرتے رہے تو لاہوری صاحب کے دلائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ ان دلائل سے زیادہ سے زیادہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرسید مسلمانوں کی ان مسلح کارروائیوں کو بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ خفیہ خط وکتابت سے ہرگز یہ مطلب اخذ نہیں ہوتا کہ وہ جاسوسی کے مجرم تھے۔ وہ ہر حال میں انگریزی حکومت کے خیر خواہ تھے اور یہ وفاداری اور خیر خواہی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ان کی مسلمانیت اور مذہبیت کا ثمرہ تھا۔ سرسید صاف اور کھرے انسان تھے۔ وہ اس بات کو اپنی مذہبیت اور مسلمانی کے خلاف تصور کرتے تھے کہ ایک طرف حکومت کی نوکری کریں اور دوسری طرف در پردہ ان کے خلاف سرگرم عمل رہیں۔ لفظ ''نمک حرام'' سے واضح ہوتا ہے کہ بغاوت کرنے والے دوغلی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے دور انحطاط میں مسلمان اغیار کو دھوکا دینے کو بھی اخلاقیات میں شمار کرتے ہیں۔ سرسید اس قسم کی اخلاقیات کی مخالف تھے چنانچہ لکھتے ہیں:

''جہاد مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ اس کے قواعد ایسے قاعدے پر مبنی ہیں جس میں ذرا بھی دغا اور فریب اور غدر و بغاوت اور بے ایمانی نہیں۔'' (بحوالہ افکار سرسید، از ضیاء الدین لاہوری، صفحہ ۲۲۳)

سرسید نے جن لوگوں کو باغیوں سے بچایا، دو وجوہ کی بنیاد پر ان کو بچانا صحیح تھا۔ اول یہ کہ سرسید ان کے نوکر تھے اور دوم یہ کہ یہ لوگ سول انتظامیہ سے متعلق تھے اور مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں نہیں تھے، اس لیے ان پر ہاتھ اٹھانا اسلامی جنگی اخلاقیات کے منافی تھا۔ تاہم یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ سرسید احمد خان نے مجاہدین آزادی کو جو گالیاں دی ہیں، وہ ناقابل دفاع ہیں اور اس کے لیے وہ رب العزت کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے۔

لاہوری صاحب نے علما کی طرف سے سرسید کی مخالفت کا سبب واضح کرتے ہوئے شیخ اکرام کا مندرجہ ذیل پیراگراف نقل کیا ہے:

''ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انہوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا، جنہیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے۔ مثلاً شیطان، اجنہ اور ملائیک کے وجود سے انکار، حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔'' (الشریعہ، اکتوبر ۲۰۰۵، ص ۲۴)

یہ درست ہے کہ مذکورہ امور سے متعلق سرسید کی رائے جمہور علماے کرام سے جدا ہے اور انہوں نے ان مخلوقات اور معجزات کے حوالے سے عقلی طور پر تاویل کی راہ اختیار کی ہیں، تاہم شیخ اکرام کی اس بات سے مکمل اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ علما نے سرسید کی مخالفت فقط مذہبی نظریات کی بنا پر کی۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہے کہ ان نظریات کی بنا پر انھوں نے ان کی مخالفت کی۔ اس کے علاوہ علما مغربی تعلیم کے بھی مخالف تھے۔ اُنھوں نے لوگوں کو اِس حد تک اس سے برگشتہ کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے مادی فوائد کی چیزوں سے بھی نفرت کرتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری مسلمانوں کے اِس رجحان کی

غمازی کرتی ہے۔ مولانا وحیدالدین خان نے لکھا ہے کہ جب ہندوستان میں ریل کی پٹڑیاں بچھائی جانے لگیں تو اس دور کے لوگوں نے اسے لوہے کی زنجیریں پھیلانے کے مشابہ قرار دیا۔ پچھلے دنوں میرے ایک ساتھی نے وزیرستان کے چند سفید ریشوں کا حال بیان کیا کہ وہ بجلی کے تاروں کو انگریزوں کی چال بازی سمجھتے تھے اور وہ سڑکوں اور ہر قسم کے ترقی یافتہ کاموں کے دشمن تھے۔ اکابر اور معاملہ فہم علما کا موقف ممکن ہے مختلف ہو، لیکن انگریزی تعلیم کے بارے میں علما کے عمومی رویے کی عکاسی پشتو کے ان اشعار سے ہوتی ہے جو سینہ بسینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو رہے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے: ''جو کوئی سرکاری مدرسے میں سبق پڑھے گا، وہ دوزخ میں غوطے کھائے گا اور جو کوئی درس نظامی کا طالب علم ہے، وہ جنت میں شہد کھائے گا۔''

اس کے علاوہ سرسید اپنے سیاسی نظریات کے لحاظ سے کانگرس کے سخت مخالف تھے جبکہ علمائے کرام مذکورہ پارٹی کی لیڈرشپ کا دم بھرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی رقم طراز ہیں:

''علما کی طرف سے سرسید احمد خان کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ انڈین نیشنل کانفرنس اور کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کے خلاف سرسید احمد خان کا موقف تھا۔ سرسید احمد خان مسلمانوں کو علیحدہ قوم سمجھتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں بلدیاتی اداروں کی نمائندگی کے مسلہ پر جداگانہ انتخاب کا پہلا نعرہ سرسید ہی نے لگایا تھا۔ جبکہ دیوبند کے علماء نے وطنی قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں کی کانگرس میں شرکت کو از روئے اسلام جائز قرار دیا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں علمائے لدھیانہ نے انڈین نیشنل کانفرنس میں مسلمانوں کی شرکت کے حق میں علمائے کرام سے بڑے پیمانہ پر فتویٰ حاصل کیا۔ اس فتویٰ کی تفصیلات رسالہ نعرۃ الابرار (۱۸۹۰) میں درج ہیں۔ اس فتویٰ پر سو علماء کے دستخط ہیں" (احیائے علوم، لاہور، نومبر ۲۰۰۵ صفحہ ۲۷)

سرسید کے سب سے بڑے مخالف مولانا ابوالکلام آزاد کی ۱۹ فروری ۱۹۴۹ء کی تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں وہ سرسید کی سیاسی فکر کا گلہ یوں کرتے ہیں:

''مسلمانوں کے اس سیاسی تعطل کے لیے اگرچہ مختلف اسباب جمع ہو گئے تھے لیکن اس کی سب سے بڑی ذمہ داری مرحوم سرسید احمد خان کی سیاسی رہنمائی پر تھی جو اس تعلیمی ادارے کے بانی اول تھے۔ انہوں نے ۱۸۸۶ء میں مسلمانان ہند کو نہ صرف کانگرس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا بلکہ سیاسی حقوق کے تمام مطالبوں کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔'' (بحوالہ مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ از محمد ضیاالدین انصاری، صفحہ ۶۷)

سرسید کی اس سیاسی فکر کی ایک کڑی ترکی کی خلافت تھی جس کے وہ مخالف تھے۔ ڈاکٹر علی صدیقی نے لکھا ہے": علماے دیوبند کے لیے سرسید احمد خان کی مخالفت کی ایک وجہ عثمانی خلیفہ کو عالم اسلام کا روحانی سربراہ ماننے سے انکار بھی ہے۔'' (احیائے علوم، لاہور، نومبر ۲۰۰۵ء، صفحہ ۲۷)

مندرجہ بالا بحث سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سرسید کی مذہبی نظریات کے علاوہ کچھ دیگر عوامل بھی تھے۔ جس کی وجہ سے وہ علماء کی نظر میں بمثل خار تھے۔ شیخ محمد اکرام کی یہ باتیں چونکہ وزن دار نہیں تھیں اس لیئے موج کوثر کے بعد کے ایڈیشنوں میں نہیں ملتی ہیں۔